جناب خالد مسعود

حدیث وسُنّت کی تحقیق کا فراہی منہاج

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے قرآن حکیم کو اپنے فکر کا مرکز و محور بنایا اور اس صحیفۂ آسمانی پر راست طریقے سے غور و تدبّر کے اصول وضع کیے جن میں اصل اہمیت لغت کے تتبع، نظائرِ قرآنی کی تلاش، آیات کے سیاق و سباق اور سورتوں کے نظم کو دی گئی۔ ان کے نزدیک ان اصولوں پر مبنی تفسیر قرآن کے حقیقی مدعا سے قریب تر ہوتی ہے اور اس کے ذریعے تاویل قرآن کے اختلاف کو بے حد کم کیا جا سکتا ہے۔ امت اگر اس طریقۂ تفسیر کو اختیار کر لے تو اس کے نتیجے میں فرقہ پرستی کی لعنت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس روایات پر مبنی طریقۂ تفسیر مفہوم کی کثرت تعبیر کے سبب سے ذہنوں کو پراگندہ کرتا اور امت کے اختلافات کو مہمیز دیتا ہے۔ چونکہ برصغیر پاک و ہند میں جن تفاسیر پر زیادہ اعتماد ہے ان کا انحصار روایات پر ہے اور انہی کی مدد سے اردو کی بیشتر تفسیریں لکھی گئیں اس لیے ہمارے دینی طبقوں میں یہ مفروضہ راہ پا گیا کہ تفسیر وہی معتبر ہے جو روایات پر مبنی ہو۔ چنانچہ مولانا فراہیؒ کا طریقہ یہاں کے علماء کو بیگانہ نظر آیا۔ چونکہ رائج طریقہ سے ہٹ کر کسی نئے طریقہ کی ممارست آسان نہیں ہوتی اس لیے فراہی طریقۂ تفسیر کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہونا بالکل قرین فہم ہے۔ البتہ جو بات ناروا ہے وہ بعض طبقوں کا نہایت بے جا اور بلا جواز یہ الزام ہے کہ مولانا فراہیؒ کا مسلک انکار حدیث سے قریب ہے چنانچہ اس کے بارے میں وہی لب و لہجہ اختیار کیا گیا جو فتنۂ انکار حدیث کے لیے اختیار کیا گیا۔

۱۹۴۱ء میں رسالۂ البیان امرتسر نے مقدمہ نظام القرآن کی بعض فصلوں کی روشنی میں مولانا فراہیؒ پر انکارِ سنت کا الزام عائد کیا۔ اس تحریر کو مزید رنگ دے کر رسالہ 'طلوع اسلام' دہلی نے ایک مضمون 'شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث" میں سمویا اور اس الزام کی تائید میں مولانا فراہیؒ کی مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ حدیث کے موضوع پر کسی تکرار کا

حوالہ دیا۔ اس مضمون سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ خدانخواستہ مولانا فراہی بھی انکارِ سنت میں ان لوگوں کے ہم مسلک تھے۔ اس مضمون کا مکمل جواب مولانا امین احسن اصلاحی نے ماہنامہ 'معارف'، اعظم گڑھ کے فروری ۱۹۴۲ء کے شمارہ میں شائع شدہ اپنے مضمون "مولانا حمیدالدین فراہی اور علم حدیث" میں دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے دکھایا کہ 'البیان' نے کس طرح مولانا فراہی کی تحریروں کو مسخ کر کے اپنے معانی پہنائے اور ضعیف تفسیری روایات پر ان کے تبصرے کو پورے ذخیرۂ حدیث پر تبصرہ کی حیثیت سے پیش کیا جو ایک خلافِ حقیقت بات تھی۔ اس مضمون میں مولانا اصلاحی نے مولانا سندھی کے ساتھ مولانا فراہی کی بحث کے بارے میں بھی واضح کیا کہ یہ بحث حدیث کے انکار و قبول سے متعلق نہ تھی بلکہ اخبارِ آحاد کی حیثیت کے بارے میں تھی جس میں بالآخر مولانا سندھی نے مولانا فراہی کا موقف سمجھ لیا تھا اور بحث ختم ہو گئی تھی۔ مجموعہ تفاسیر فراہی میں اپنے استاذ گرامی کے حالات میں مولانا اصلاحی نے لکھا ہے کہ معارف میں شائع شدہ ان کے مضمون کی اشاعت کے بعد جب ان کی ملاقات مولانا سندھی سے ہوئی تو ان سے اس مضمون کا ذکر بھی ہوا جس پر انھوں نے بار بار اس بات پر تاسف کا اظہار کیا کہ طلوع اسلام کی روایت سے ان کے محبوب دوست کے متعلق بدگمانی پیدا ہوئی۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن کی اشاعت کے بعد جہاں متعدد اہل علم نے مولانا کو قرآن کی اس خدمت پر مبارک باد دی کہ انھوں نے مولانا فراہیؒ کے طریقہ پر عصر حاضر کی ایک عظیم تفسیر لکھ ڈالی جو ہر غور و تدبر کرنے والے شخص کے لیے بہت بڑی نعمت ہے، وہیں بعض حلقوں میں اسی قدیم الزام کی بازگشت سنی گئی کہ فراہی فکر کے ڈانڈے فتنۂ انکارِ حدیث کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ اس الزام کا ایک جواب تو مولانا اصلاحی کی کتاب مبادی تدبر حدیث اور ان کے وہ دروس ہیں جو موطا امام مالکؒ اور صحیح بخاری کی شرح میں رسالہ تدبر لاہور میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر فراہی کے منتسبین حدیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی مشکلات کو حل کرنے کی اسی طرح راہ ہموار کر رہے ہیں جس طرح انھوں نے قرآن کی تفسیر کے معاملہ میں کی ہے۔ تاہم ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس فکر کے امام

مولانا فراہیؒ کے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

چونکہ مولانا فراہیؒ ہمہ تن قرآن مجید کی غواصی میں مشغول رہے، انھوں نے علم حدیث پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ اگر وہ حدیث کو موضوع بناتے تو اپنے طریقہ کے مطابق وہ اس کے مطالعہ کے لیے بھی یقیناً نہایت اہم نشانِ راہ متعین کر دیتے۔ اس وقت ہمیں ان کے نقطۂ نظر کی تحقیق کے لیے ان کتابوں کا سہارا لینا ہو گا جن میں انھوں نے ضمناً حدیث پر کچھ لکھا ہے۔ اس میں کچھ مدد ہمیں مقدمہ نظام القرآن سے مل سکتی ہے، چند اشارات بعض سورتوں کی تفسیر میں ملتے ہیں اور کچھ مباحث ان کی دو کتابوں — 'اصول التاویل' اور 'احکام الاصول' میں آ گئے ہیں۔

سُنّت کی حیثیت

کتاب "احکام الاصول"[1] میں مولانا فراہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا تو حکمت اور اسرارِ شریعت کی تعلیم بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں داخل کر دی تاکہ امت اجتہاد کے قابل ہو سکے، اپنی عقلوں کو استعمال کرنا سیکھے اور ظاہری و باطنی دلائل سے استدلال کر سکے۔ پس حضورؐ ہمارے لیے کتاب اللہ کی تبیین کرتے تھے تاکہ ہم پر قرآن کے اشارات پر تفکر و تدبر کا منہاج واضح ہو۔"

مقدمہ نظام القرآن کی فصل بعنوان 'معروف و منکر' میں لکھتے ہیں:

> "نبی کی روح بیدار خود بھی معروف و منکر کی شناخت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارہ میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی ان میں وہ اپنے الہام سے امت کو کوئی حکم اس وقت تک کے لیے دے دیتا ہے جب تک

---

[1] مولانا کی یہ تصنیف ابھی تک غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔

وحی نہ آجائے اور یہ کام اس کے منصب کا ایک قدرتی جزو ہوتا ہے۔"[1]

احکام الاصول میں انھوں نے نبی کی اس روح بیدار کا سرچشمہ اس خاص نور وحکمت کو قرار دیا ہے جس کا حوالہ سورہ شوریٰ میں آیا ہے: "وکذٰلک أوحینا الیک روحاً من امرنا ماکنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان ولکن جعلناہ نوراً نہدی بہ من نشاء من عبادنا وانک لتہدی الی صراط مستقیم"۔ (۵۲)

لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قرآن مجید کی جہت مکنون کی طرف بھی رہنمائی فرمائی تھی۔ اس نے اس روح سے نبی کے قلب کو زندگی بخشی اور اس نور کی ہدایت دے کر آپ کو وہ علم بخشا جو آپ کو پہلے حاصل نہ تھا۔ اس لیے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کو سُنّت کی مستقل بنیاد سمجھا جائے گا۔"

"رسول اللہ کا حکم یکساں طور پر پُراز حکمت ہوتا ہے، خواہ وہ کتاب کی بنیاد ہو، یا اس نور وحکمت کے مطابق جس سے خدا نے آپ کا سینہ بھر دیا تھا۔"

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا فراہی کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ وسلم کا منصب قرآن حکیم کی تبیین تھا۔ اس منصب کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپ اپنی روح بیدار اور اس نور وحکمت کے باعث، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی، قرآن حکیم کے احکام کے علاوہ اپنے طور پر احکام دے سکتے تھے اور ان کی حیثیت وہی ہوتی جو وحی کے احکام کی ہوتی۔ یہی احکام ہیں جن سے سنّتِ رسول عبارت ہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا فراہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح امت کے اسلاف اور ائمہ دین قائل تھے۔

امام فراہی کا ایک نہایت اہم نکتہ جو سنت کے بارے میں ان کے نظریہ کو واضح کرتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت قرآن کا جو ذمہ لے رکھا ہے اس میں وہ تمام اصطلاحاتِ شرعیہ جن کا ذکر قرآن میں ہے، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، طواف صفا ومروہ، مسجد حرام وغیرہ، شامل ہیں اور ان کا مفہوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے

---

[1] ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۵۹

واضح ہوا ہے جو تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے خلف کو منتقل ہوا ہے۔ لہذا ان اصطلاحات کے معانی اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح حضورؐ نے ان کی تعلیم دی تھی۔ جو نماز دین میں مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان آج پڑھتے ہیں۔ حج کا مفہوم دین میں وہی ہے جو آج مسلمانوں میں رائج ہے، ہرچند کہ نماز کی ہیئت یا حج کے فرائض وسنن میں بعض جزوی اختلافات نظر آتے ہیں، یہ اختلافات ناقابلِ لحاظ ہیں۔

احکام الاصول میں اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

"سلف اور ائمہ نے اپنے مذہب کی صحت کی بدولت کتاب اور سنّت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا۔ یہ نہیں کیا کہ باطل پسندوں اور ملحدوں کی طرح ان میں تفریق کر کے ایک چیز کو ترک کر دیتے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی سنت کے منکرین کو باطل پر سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دین کا صحیح تقاضا یہ تھا کہ کتاب اور سنّت دونوں کو لازم پکڑا جائے۔ ان میں تفریق پیدا کرنا یا سنت کا انکار کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔ ایک ایسے متقی شخص کو جس کے نزدیک انکارِ سنّت ایک ملحدانہ روش ہو، انکار سنّت کا الزام دینا انہی لوگوں کو زیب دیتا ہے جن کے دل خوفِ خدا سے خالی ہو چکے ہوں۔

حدیث کی حیثیت

مولانا فراہی کا نقطۂ نظر حدیث کے بارے میں یہ ہے کہ وہ قرآن کو اصل اور حدیث کو ایک فرع کی حیثیت دیتے ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کی صحت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے جب کہ روایت حدیث میں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ صحیح طور پر محفوظ نہ کی گئی ہو۔ مقدمہ نظام القرآن میں تفسیر کے خبری مآخذ کے تحت لکھتے ہیں:

"اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں — اوّل، وہ احادیث نبویہ جن کو علمائے امت نے پایا۔ دوم، قوموں کے وہ ثابت شدہ احوال

جن پر امت نے اتفاق کیا۔ سوم، گزشتہ انبیاء کے صحیفوں میں جو کچھ محفوظ رہ گیا ہے۔ اگر ان تینوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی۔"[1]

آگے فرماتے ہیں:

"ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم و ظن کے لیے بہت کچھ گنجائش ہے۔"[2]

اس سے معلوم ہوا کہ ارشادات نبویہ کو دین و شریعت کی بنیاد ماننے اور سنّت کی تشریعی حیثیت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا فراہی روایت حدیث کو یہ حیثیت دینے کو اس لیے تیار نہیں کہ روایت میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے اور اس طرح اس میں وہم و ظن کو دخل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ائمہ محدثین کو بھی انکار نہیں۔ اسی لیے تو انھیں روایات کو پرکھنے کے لیے روایت و درایت کے اصول وضع کرنا پڑے اور راویوں کی جرح و تعدیل کے لیے فنون وجود میں آئے۔ اگر روایت حدیث میں ظن و شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ان علوم و فنون میں سے کسی کی ضرورت نہ ہوتی۔

ائمہ محدثین کے نہایت ذمہ دارانہ نقطۂ نظر کے برعکس موجودہ زمانے کے بعض علماء حدیث کے بارے میں جو غلو کرتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مقدمہ نظام القرآن میں لکھتے ہیں:

"بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو ان کی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور ان سے سلسلۂ نظم درہم برہم ہوتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے۔ بلکہ بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کے

---

[1] ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۹۔ [2] ایضاً ص ۴۱

نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل۔"[1]

آگے لکھتے ہیں:

"سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔"[2]

ان اقتباسات کو جو شخص بھی غیر متعصب ہو کر پڑھے گا وہ یہ رائے قائم کرے گا کہ مولانا فراہی جس چیز پر معترض ہیں وہ حقیقی ارشادات نبویہ نہیں بلکہ صرف وہ روایات ہیں جو قرآن مجید سے متناقض یا اس کے منافی اور اس اصل کو ڈھانے والی یا اس کو جھٹلانے والی ہیں۔ وہ حدیث کی کتابوں میں نقل ہو جانے والی ہر روایت کے قرآن کی طرح محفوظ ہونے کے تصور کو غلو پر مبنی سمجھتے ہیں۔ یہ بات کہ بخاری اور مسلم کی تمام مرویات ظن سے بالاتر نہیں ہیں کوئی نئی بات نہیں جو صرف مولانا فراہی نے کہی ہو بلکہ یہ تمام ائمہ فن کے ہاں مسلّم امر ہے۔ اس آسمان کے نیچے ظن سے بالاتر واحد کتاب قرآن مجید ہے۔

اسی طرح کے غلو کا نتیجہ بعض فقہاء و متکلمین کا یہ خیال بھی ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہو۔ پس جب یہ ائمہ حدیث جو حدیث کے معاملہ میں صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس بارہ میں فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسول، اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے، اس طرح کے مواقع میں تمام تر دخل راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو ہے۔"[3]

---

[1] ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۹؛ [2] ایضاً ص ۳۹، [3] ایضاً ص ۴۱

حدیث کے بارے میں یہ تو مولانا فراہی کی ا صولی آرا رہیں۔ جب وہ ان اصولوں پر روایات کو جانچتے ہیں تو بکثرت ایسی ضعیف روایات کو جن کی صحت پر محدثین کو کلام ہے۔ اس بنا پر قبول کر لیتے ہیں کہ وہ قرآن سے مطابقت رکھتی اور اس کی تصدیق و تائید کرتی ہیں چنانچہ سورہ کوثر کی تفسیر میں حوض کوثر اور کثرت امت سے متعلق متعدد روایات کو انھوں نے بعینہٖ قبول کر لیا ہے۔ آیت فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کے موقع نزول کے متعلق جس روایت میں امام سیوطیؒ نے غرابت ظاہر کی ہے مولانا فراہی نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام سیوطیؒ کو جن اسباب کی بدولت یہ وہم ہوا وہ غور و تامل کے بعد بے حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ سورہ کافرون کی تفسیر میں ایک مستقل فصل اس موضوع پر لکھی ہے کہ ہجرت کے جنگ اور براءت ہونے کا ثبوت احادیث سے بھی ملتا ہے اور یہ موافقت قرآن کے اصول کے عین مطابق ہے۔

مولانا فراہی کی کتابوں میں جا بجا ایسی تحریریں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث کی تحقیق میں کن اصولوں کو مد نظر رکھتے تھے۔ ہم اس کی وضاحت کے لیے ان اصولوں کو چار عنوانات کے تحت لا سکتے ہیں:

ا۔ احکام کی احادیث

ب۔ تفسیری روایات

ج۔ اسرائیلیات

د۔ اخبار آحاد

ا۔ احکام کی احادیث

سورۂ نسار کی آیت ۱۰۵ "انا انزلنا الیک الکتٰب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰیک اللہ" کی روشنی میں مولانا فراہی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس معاملہ میں کوئی حکم موجود ہوتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مامور تھے کہ اسی کی روشنی میں فیصلہ فرماتے۔ یہ جائز نہ تھا کہ آپ کتاب اللہ کی رہنمائی کے بغیر کوئی فیصلہ صادر کر دیں۔ چنانچہ

احکام کی بہت سی حدیثیں آیات قرآنی سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔ وہ قرآن پر اضافہ نہیں کرتیں بلکہ کسی ایسے گہرے معاملہ کی تصریح کر دیتی ہیں جو اگرچہ قرآن کی آیت میں موجود تھا لیکن تدبر نہ کرنے والے پر مخفی رہ سکتا تھا۔ مولانا فراہی نے اس موضوع پر اپنی مستقل تصنیف احکام الاصول میں یہ دکھایا ہے کہ قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کے اثبات، ترکہ میں وصیت کا حکم باقی ہونے، مقدار وصیت کے ایک ثلث مال تک محدود ہونے، خالہ اور پھوپھی کے محرمات میں سے ہونے اور ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہونے کی احادیث قرآنی نصوص سے کس طرح مستنبط ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز اسلمی کو جو رجم کروایا وہ سورہ مائدہ کی آیت محاربہ سے مستنبط تھا۔ مولانا پورے اطمینان سے لکھتے ہیں کہ مجھے احکام کی بیشتر احادیث کی بنیادیں قرآن میں تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ بسا اوقات حضورؐ خود اس بات کی وضاحت فرما دیا کرتے کہ میرا یہ حکم فلاں آیت سے ماخوذ ہے۔ جہاں آپ نے اس طرح کی وضاحت نہیں فرمائی وہاں غور و تدبر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے کن آیات کی روشنی میں کوئی حکم دیا۔ اس کے بعد مولانا فراہی یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ اگر کسی حکم کا ماخذ قرآن میں متعین نہ کیا جا سکے اور حدیث کا حکم قرآن کے خلاف نہ ہو بلکہ اس پر اضافہ ہو تو یہ اضافہ اس بنا پر قبول کر لیا جائے گا کہ وہ اس نور و بصیرت کا نتیجہ ہے جو حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص عطا ہوئی تھی۔ ایسے احکام کو سنت میں مستقل اصل قرار دیا جائے گا کیونکہ ہمیں اطاعتِ رسول کا حکم دیا گیا ہے۔ احکام کی ایسی روایات جن کی بنیاد نہ قرآن میں ملتی ہو اور نہ اس اضافہ کا قرآن متحمل ہوتا ہو، اور وہ قرآن کے نصوص کے خلاف ہو یا ان کے ماننے سے قرآن کا جلی یا خفی نسخ لازم آتا ہو ان کو ترک کرنا ضروری ہوگا کیونکہ ان کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ درست نہیں۔ ان احکام کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔

ب۔ تفسیری روایات

مولانا فراہی قرآن کی تفسیر میں حدیث رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ کو وہی اہمیت دیتے

ہیں جو ہمیں دیگر ائمہ کے ہاں نظر آتی ہے لیکن تفسیری روایات کے ضعف کے بھی وہ اسی طرح قائل ہیں جس طرح خود محدثین قائل ہیں اور یہ بات تو زبان زد عوام ہے کہ تفسیر، مغازی اور فضائل کی حدیثوں پر اس طرح کام نہیں ہوا جیسا کام محدثین نے باقی ذخیرہ حدیث پر کیا ہے۔

مولانا اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ کے مبیّن و مفسّر تھے، اس لیے شرائع ہوں یا عقائد، آپ کی تاویلات ایک مفسّر کے لیے علم کی مضبوط ترین بنیاد ہیں۔"

اپنے مقدمہ تفسیر میں فرماتے ہیں:

"پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے، خود قرآن ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے۔ پس میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبرؐ اور صحابہؓ سے منقول ہو۔" [1]

اس کے بعد وہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول آثار کو بالعموم نظم قرآن سے قریب تر بتاتے ہیں۔ پھر اپنے طریقہ تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید پیش کیا کرتا ہوں۔ پہلے ایک آیت کی تاویل اس کی ہم معنی دوسری آیات سے کرتا ہوں۔ اس کے بعد تبعاً اس سے متعلق صحیح احادیث کا ذکر کرتا ہوں تاکہ نہ تو ان منکرین ہی کو کسی اعتراض کا موقع ملے جنھوں نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے . . .۔" [2]

حدیث کو اصل نہ ماننے کی وجہ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ احادیث میں صحیح و سقیم کی تمیز ایک مشکل کام ہے اور دین کی بنیاد کسی غلط روایت پر رکھنا بے حد خطرناک ہے۔ لہٰذا وہ مُصر ہیں کہ دین کے ہر معاملہ کی بنیاد قرآن کی نصوص ہی پر قائم

---

[1] ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۵، [2] ایضاً ص ۳۶

کرنی چاہیے۔ کتاب اصول التاویل میں لکھتے ہیں:

"قرآن کو سمجھے بغیر اگر آپ حدیث کی طرف دیوانہ وار رجوع کریں جب کہ اس میں صحیح و سقیم دونوں طرح کی روایات ملی ہوئی ہیں تو دل میں کوئی ایسی رائے بیٹھ جاتی ہے جس کی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی وہ قرآن کی ہدایت کے مخالف بھی ہوتی ہے۔ اس کی بنا پر آپ تاویل قرآن میں کسی سقیم حدیث پر اعتماد کر لیتے ہیں اور اس طرح حق باطل کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ سیدھا راستہ یہ ہے کہ آپ قرآن سے ہدایت حاصل کریں، اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھیں۔ اس کے بعد احادیث پر غور کریں۔ اگر بادی النظر میں ان کو قرآن سے بیگانہ پائیں تو ان کی تاویل کتاب اللہ کی روشنی میں کریں۔ اگر مطابقت پیدا ہو جائے تو اس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ اگر تطابق ممکن نہ ہو تو قرآن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس طرزِ عمل کی بنیاد یہ ہے کہ ہمیں پہلے اللہ کی اطاعت کا اور پھر رسول کی اطاعت کا حکم ہوا ہے۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ ہی اطاعت ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کلام کو رسول اللہؐ سے مروی کلام پر مقدم رکھا جائے تو اس نے حکم میں ترتیب کیوں قائم کی؟" [1]

مولانا کے نزدیک تفسیری روایات کا باہم اختلاف ان کو بے سوچے سمجھے قبول کرنے میں مانع ہے۔ دورِ صحابہ میں تاویل کا جو اختلاف ہوا اس کی نوعیت تو یہ تھی کہ ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں میں ادا کر دیا گیا لہٰذا آدمی ان میں سے جس تاویل کو لے لے وہ حقیقی مدعا سے دور نہیں ہونے پاتا۔ بعد کے ادوار میں ضعیف روایات کی کثرت ہوئی اور لوگوں نے تفسیر میں ان پر اعتماد کر لیا تو کتب تفسیر یہود اور وضع حدیث کرنے والے دجّالوں کی روایات سے بھر گئیں۔ تفسیری روایات کے اختلاف کی وضاحت مقدمہ نظام القرآن

---

[1] رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، المجموعۃ الاولیٰ، التکمیل فی اصول التاویل، الدائرۃ الحمیدیہ ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۱ء، ص ۲۷۵-۲۷۶

میں یوں کرتے ہیں :

"مثال کے طور پر فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر میں حضرت علیؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ان کے نزدیک نحر سے مراد نماز کی حالت میں سینے پر ہاتھ رکھنا ہے۔ انہی حضرت علیؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ سے نحر کی بابت پوچھا کہ یہ قربانی کیسے کرنی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا حکم نہیں بلکہ نماز میں رفع یدین کا حکم ہے۔ ابن عباسؓ کا قول روایات میں یوں آیا ہے کہ اس آیت میں عیدالاضحیٰ کے دن واجب نماز اور قربانی کا ذکر ہے جب کہ ابن مردویہ نے انہی ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نحر سے مراد نماز میں رفع یدین کرنا ہے۔

لفظ کوثر اور لفظ فلق کے معانی میں بھی اسی طرح کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسی متناقض روایات نقل ہوئی ہیں جن سے اطمینان حاصل ہونے کی کوئی سبیل نہیں۔ جو پیاسا ان سے اپنی پیاس بجھانا چاہے گا یہ اس کی پیاس میں اور اضافہ کریں گی اور جو ان کی طرف مائل ہوگا اس کی پریشانی دوچند کر دیں گی۔"[۱]

ج۔ اسرائیلیات

اہلِ کتاب کی جو روایات حدیث کی کتابوں میں آگئی ہیں ان کے بارے میں مولانا فراہی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مفسّرین نے بالعموم ان کو ایسے لوگوں سے نقل کیا ہے جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ ان میں بیشتر بے اصل افسانے ہیں جو اہل کتاب کی معتبر کتابوں سے ثابت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اہل کتاب سے متعلق امور کا حوالہ دینے کے لیے اسرائیلیات پر اعتماد کرنے سے بہتر ہے کہ ان کی معتبر کتابوں کو

---

[۱] فاتحہ تفسیر نظام القرآن، مطبعۂ اصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ ۱۳۵۷ھ، ص ۳۳-۳۴

ماٰخذ بنایا جائے۔ اگر وہ قرآن کے موافق ہوں تو ان کو قرآن کی تائید میں پیش کیا جائے اور اگر مختلف ہوں تو ان کو نظرانداز کر دیا جائے کیونکہ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان کتابوں میں حق کو چھپایا گیا ہے۔ لازم ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے اسی کو اصل مانا جائے۔

د۔ اخبار آحاد

مولانا فراہی سنت رسول اور تعامل صحابہ کی پیروی پر زیادہ زور دیتے ہیں اور خبر واحد کی بنا پر غلو، افراط و تفریط اور فرقہ آرائی کو پسند نہیں کرتے۔ مقدمہ نظام القرآن میں لکھتے ہیں :

"پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری تعریف اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو ان کے بارہ میں خواہ مخواہ اخبار آحاد پر نہیں جم جانا چاہیے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی شک میں پڑو گے اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور ان سے جھگڑو گے اور تمھارے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔ ایسی صورتوں میں صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جھگڑا نہ کرو۔"[۱]

شرح موطا کے حاشیہ پر لکھتے ہیں :

"سنتِ سلف متصل است تا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و متواتر است۔ و احاد خبر محتمل صدق و کذب و خطاء فہم و تبدیل در ادائے خبر ست — و طریقِ امام مالک و ابو حنیفہ اعتماد بر سنت است کہ زمان تابعین را در یافتہ بودند۔ بعد ازاں سنت خود تغیر یافت و اعتماد علما بر اخبار و روایات

---

[۱] ترجمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۴۲

باقی ماند"

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی خبر واحد پر انحصار کو اس لیے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس میں صدق و کذب دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ نیز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ راوی نے بات کو ٹھیک سمجھا یا نہیں یا وہ مفہوم کو درست طور پر ادا کر پایا نہیں۔ اس کے برعکس تعامل صحابہ و تابعین پر اعتماد جو امام مالک کا طریقہ ہے یا اجتہاد کی راہ اختیار کرنا جو امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے، مولانا کے نزدیک زیادہ قرین صواب تھا۔ اور یہی وہ موضوع تھا جس پر مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ ان کی بحث ہوئی جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

روایت کو رد یا قبول کرنے میں مولانا فراہی کے پیش نظر جو اصول تھے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اصل و اساس کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔

۲۔ سنت ثابتہ منصب رسالت کا ایک قدرتی جزو اور شریعت کی ایک مستقل بنیاد ہے۔ قرآن اور سنت میں تفریق کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔

۳۔ حدیث کی حیثیت ایک فرع کی ہے جس کا باعث اس کی روایت میں ظن کا دخل ہے۔

۴۔ ان روایات کو قبول کرنا جائز نہیں جو اصل کے خلاف اور نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہوں۔

۵۔ قرآن کی تصدیق و تائید کرنے والی تمام روایات قابل قبول ہیں۔

۶۔ قرآن اور حدیث کے درمیان اختلاف کی صورت میں حکم قرآن ہوگا۔

۷۔ خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ ظن کی بنیاد پر نسخ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اصل کرنے کا کام قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ہے۔

تحقیق حدیث کے لیے مولانا فراہی روایت کو ان اصولوں پر پرکھتے اور روایت اور درایت دونوں کے لحاظ سے حدیث کا درجہ متعین اور اس کے رد و قبول کا فیصلہ کرتے۔ مثال کے طور پر سورہ عبس کے شان نزول کی روایات میں سے حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، مجاہد اور ضحاک کی روایات پر انھوں نے جو تبصرہ کیا ہے اس میں حسب ذیل پہلوؤں سے انھوں نے تحقیق کی ہے:

ا۔ ان سب روایات کی سند ضعیف ہے۔

ب۔ ان کا دیا ہوا تاثر قرآن کے اشارات کے منافی ہے۔

ج۔ روایات میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت اوہام کی ہو کر رہ گئی ہے۔

د۔ ابتدائی راویوں میں سے کوئی بھی خود شریک واقعہ نہ تھا لہٰذا یہ روایات خبر کا فائدہ نہیں دیتیں۔

ہ۔ ان کو قبول کرنے سے اللہ تعالیٰ کی غیب دانی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ صحیح روایت سے غلط نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔

اس بحث کے بعد مولانا نے مجاہد کی ایک روایت کو اختیار کیا ہے جس پر یہ اعتراضات وارد نہ ہوتے تھے۔

سورۂ فیل کی تفسیر میں ابرہہ سے عبدالمطلب کی ملاقات کی روایات پر مولانا نے یوں تبصرہ کیا ہے:

ا۔ یہ روایات از روئے سند قابلِ اعتماد نہیں۔ یہ ابن اسحاق پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں، اور ابن اسحاق یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت لے لیتے ہیں۔

ب۔ اس موضوع پر موجود دوسری روایات سے ان روایات کی تردید ہوتی ہے۔

ج۔ عربوں کا معروف کیرکٹر وہ نہیں ہے جو ان روایات سے سامنے آتا ہے۔

د۔ یہ روایات دشمنوں کی وضع کردہ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان میں عربوں کی غیرت و حمیت کی تحقیر اور سردار قریش عبدالمطلب کی توہین پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ابرہہ کا کیرکٹر نہایت شاندار بتایا گیا ہے۔

ان تبصروں سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی تحقیق روایت میں سند کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ پہلو لازماً دیکھتے کہ وہ قرآن کے اشارات کے موافق ہے یا مخالف۔ وہ راوی کے متعلق یہ تحقیق کرتے ہیں کہ وہ خود شریکِ واقعہ تھا یا محض شنید پر مبنی معلومات دے رہا ہے۔ وہ درایت کے اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے دیکھتے کہ روایت معروفات کے خلاف تو نہیں اور اس سے قرآن

کے کسی اصول پر زد تو نہیں پڑتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حدیث کے ساتھ مولانا کا معاملہ کسی درجہ میں بھی سوءظن اور انکار کا نہیں ہے بلکہ اہلِ تحقیق کے عام طریقہ کے مطابق وہ روایات پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کی تاویل قرآن کے موافق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن کے ساتھ اس کو تطبیق دینے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ روایات میں تضاد ہو تو ان میں بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر کسی روایت کو قرآن کے نصوص کے متناقض سمجھتے ہیں تو اس کو بکثرت دلائل دے کر مسترد کرتے ہیں ورنہ اس کے بارے میں توقف کرتے ہیں کیونکہ بہرحال قرآن اصل اور حدیث اس کی فرع کے درجہ میں ہے۔